کرکٹ

مرزا عبدالودود بیگ کا یہ دعویٰ کچھ ایسا غلط نہیں ہوتا کہ کرکٹ بڑی تیزی سے ہمارا قومی کھیل بنتا جارہا ہے۔ قومی کھیل سے غالباً اُن کی مراد ایسا کھیل ہے جسے دوسری قومیں نہیں کھیلتیں۔

ہم آج تک کرکٹ نہیں کھیلے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں اس کی بُرائی کرنے کا حق نہیں۔ اب اگر کسی شخص کو کتّے نے نہیں کاٹا، تو کیا اس بدنصیب کو کتّوں کی مذمت کرنے کا حق نہیں پہنچتا؟ ذرا غور کیجیے۔ افیم کی بُرائی صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو افیم نہیں کھاتے۔ افیم کھانے کے بعد ہم نے کسی کو افیم کی بُرائی کرتے نہیں دیکھا — بُرائی کرنا تو بڑی بات ہے، ہم نے کچھ بھی تو کرتے نہیں دیکھا۔

اب بھی بات صاف نہیں ہوئی تو ہم ایک اور مُستند نظیر پیش کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو گُڑ سے سخت چڑ تھی۔ ان کا قول ہے جس نے ایک مرتبہ گُڑ چکھ لیا اس کو تمام عمر دُوسری مٹھاس پسند نہیں آ سکتی۔ چونکہ وہ خود شکر کی لطیف حلاوتوں کے عادی مدّاح تھے، لہٰذا ثابت ہُوا کہ وہ بھی ساری عمر گُڑ کھائے بغیر گُڑ کی بُرائی کرتے رہے۔

یُوں تو آج کل ہر وہ بات جس میں ہارنے کا امکان زیادہ ہو، کھیل سمجھی جاتی ہے، تاہم کھیل اور کام میں جو بیّن فرق ہماری سمجھ میں آیا، یہ ہے کہ کھیل کا مقصد خالصتاً تفریح ہے۔ دیکھا جائے تو کھیل کام کی ضِد ہے۔ جہاں اس میں گمبھیرتا آئی اور یہ کام بنا۔ یہی وجہ ہے کہ پولو انسان کے لیے کھیل ہے اور گھوڑے کے لیے کام! ضِد کی اور بات ہے ورنہ خود مرزا بھی اس بنیادی فرق سے بے خبر نہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن وہ ٹنڈو الٰہ یار سے معاوضہ پر مشاعرہ ''پڑھ'' کے لوٹے تو ہم سے کہنے لگے:

Scanned with CamScanner

''فی زمانہ ہم تو شاعری کو، جب تک وہ کسی کا ذریعۂ معاش نہ ہو، نری عیاشی بلکہ بدمعاشی سمجھتے ہیں۔''

اب یہ تنقیح قائم کی جا سکتی ہے کہ آیا کرکٹ کھیل کے اس معیار پر پُورا اُترتا ہے یا نہیں۔ فیصلہ کرنے سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کرکٹ دراصل انگریزوں کا کھیل ہے اور کچھ اُنھی کے بلغمی مزاج سے لگا کھاتا ہے۔ اُن کی قومی خصلت ہے کہ وہ تفریح کے معاملے میں اِنتہائی جذباتی ہو جاتے ہیں اور معاملاتِ محبّت میں پرلے درجے کے کاروباری! اسی خوش گوار تضاد کا نتیجہ ہے کہ ان کا فلسفہ حد درجہ سطحی اور مزاح نہایت گہرا!

کرکٹ سے ہماری دل بستگی ایک پُرانا واقعہ ہے جس پر آج سو سال بعد تعجّب یا تاسّف کا اظہار کرنا اپنی ناواقفیتِ عامہ کا ثبُوت دینا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی رستخیز کے بعد، بلکہ اس سے کچھ پہلے ہی، ہمارے پُرکھوں کو انگریزی کلچر اور کرکٹ کے باہمی تعلق کا احساس ہو چلا تھا۔ چنانچہ سرسید احمد خاں نے بھی انگریزی تعلیم وتمدّن کے ساتھ ساتھ کرکٹ کو اپنانے کی کوشش کی۔ روایت ہے کہ جب علی گڑھ کالج کے لڑکے میچ کھیلتے ہوتے تو سرسیّد میدان کے کنارے جانماز بچھا کر بیٹھ جاتے۔ لڑکوں کا کھیل دیکھتے اور رو رو کر دُعا مانگتے:

''اِلٰہی! میرے بچوں کی لاج تیرے ہاتھ ہے۔''

جیسا کہ اُوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، کرکٹ انگریزوں کے لیے مشغلہ نہیں، مشن ہے لیکن اگر آپ نے کبھی کرکٹ کی ٹیموں کو مئی جون کی بھری دوپہر میں ناعاقبت اندیشانہ جرأت کے ساتھ موسم کو چیلنج کرتے دیکھا ہے تو ہماری طرح آپ بھی اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ ہمارے ہاں کرکٹ مشغلہ ہے نہ مشن، اچھی خاصی تعزیری مشقّت ہے، جس میں کام سے زیادہ عرق ریزی کرنا پڑتی ہے۔ اب اگر کوئی سر پھرا مُنہ مانگی اُجرت دے کر بھی اپنے مُزدوروں سے ایسے موسمی حالات میں یوں کام کرائے تو پہلے ہی دن اس کا چالان ہو جائے۔ مگر کرکٹ میں چونکہ عام طور سے معاوضہ لینے کا دستور نہیں، اس لیے چالان کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاتھوں جس طرح ہلکا پُھلکا کھیل ترقی کر کے کام میں تبدیل ہو گیا وہ اس کے مُوجدین کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔ غالبؔ نے شاید ایسی ہی کسی صُورتِ حال سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ہم مغل بچّے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔

اور اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کھیل کے معاملے میں ہمارا روّیہ بالغوں جیسا نہیں، بالکل بچّوں کا سا ہے — اس لحاظ سے کہ صرف بچے ہی کھیل میں اِتنی سنجیدگی برتتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے بچّہ سیانا ہوتا ہے کھیل کے ضمن میں اس کا روّیہ غیر سنجیدہ ہوتا چلا جاتا ہے اور یہی ذہنی

Scanned with CamScanner

بلوغ کی علامت ہے۔

کرکٹ کے رسیا ہم جیسے آشنائے فن کو لاجواب کرنے کے لیے اکثر کہتے ہیں:

''میاں! تم کرکٹ کی باریکیوں کو کیا جانو؟ کرکٹ اب کھیل نہیں رہا، سائنس بن گیا ہے سائنس!''

عجیب اتفاق ہے۔ تاش کے دھتیا بھی رمی کے متعلق نہایت فخر سے دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ سولہ آنے سائنٹیفک کھیل ہے۔ بکنے والے بکا کریں لیکن ہمیں رمی کے سائنٹیفک ہونے میں مطلق شُبہ نہیں۔ کیوں کہ ہمیں یقین ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ روپیہ ہارنے کا اس سے زیادہ سائنٹیفک طریقہ ہنوز دریافت نہیں ہُوا۔ پس ثابت ہُوا کہ کرکٹ اور رمی قطعی سائنٹیفک ہیں۔ اور اسی بِنا پر کھیل نہیں کہلائے جاسکتے۔ بات یہ ہے کہ جہاں کھیل میں دماغ پر زور پڑا کھیل کھیل نہیں رہتا، کام بن جاتا ہے۔ ایک دفعہ کرکٹ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے ہم نے مرزا سے کہا کہ کھیلوں میں وہی کھیل افضل ہے جس میں دماغ پر کم سے کم زور پڑے۔

فرمایا ''بجا! آپ کی طبعِ نازک کے لیے جُوا نہایت موزوں رہے گا۔ کس واسطے کہ جُوئے کی قانونی تعریف یہی ہے کہ اسے کھیلنے کے لیے عقل قطعی استعمال نہ کرنی پڑے۔''

محض کرکٹ ہی پر منحصر نہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہ رجحان عام ہے کہ تعلیم نہایت آسان اور تفریح روز بروز مشکل ہوتی جاتی ہے۔ (مثلاً بی اے کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، مگر برج سیکھنے کے لیے عقل درکار ہے) ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما اور باتصویر کتابوں نے اب تعلیم کو بالکل آسان اور عام کر دیا ہے، لیکن کھیل دن بدن گراں اور پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں۔ لہٰذا بعض غبّی لڑکے کھیل سے جی چُرا کر تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے ہیں۔ اس سے جو سبق آموز نتائج رونما ہُوئے وہ سیاست دانوں کی صُورت میں ہم سب کے سامنے ہیں۔

کِسی اعتدال پسند دانا کا قول ہے کہ ''کھیل کے وقت کھیل اور کام کے وقت کام اچھا۔'' اگر ہم یہ کہیں کہ ہمیں اس زرّیں اُصول سے سراسر اختلاف ہے تو اس کو یہ معنی نہ پہنائے جائیں کہ خدانخواستہ ہم شام وسحر، آٹھوں پہر کام کرنے کے حق میں ہیں۔ سچ پُوچھیے تو ہم اپنا شمار اُن نارمل افراد میں کرتے ہیں، جن کو کھیل کے وقت کھیل اور کام کے وقت بھی کھیل ہی اچھا لگتا ہے۔ اور جب کُھل کے باتیں ہورہی ہیں تو یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ فی الواقع کام ہی کے وقت کھیل کا صحیح لُطف آتا ہے۔ لہٰذا کرکٹ کی مخالفت سے یہ استنباط نہ کیجیے کہ ہم تفریح کے خلاف بپھرے ہوئے بوڑھوں (Angry Old Men) کا کوئی متحدہ محاذ بنانے چلے ہیں۔ ہم بذاتِ خُود سو فی صد تفریح کے حق میں ہیں، خواہ وہ تفریح برائے تعلیم ہو، خواہ تعلیم براہِ تفریح! ہم تو محض یہ اَمر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ قدیم طریقِ تعلیم سے جدید طرزِ تفریح ہزار درجے بہتر ہے۔

Scanned with CamScanner

مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

تمہید قدرے طویل اور سُخن گسترانہ سہی، لیکن بوجوہ ناگزیر تھی۔ اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور آنکھوں دیکھا حال سُناتے ہیں۔

ٹیسٹ میچ کے ہنگامہ پرور زمانے کا ذکر ہے۔ شہر کی آبادی دو حصّوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک حِصّہ کہ

جس میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہُشیار بھی ہیں

اپنے اپنے گھروں میں بیٹھا ریڈیو کمنٹری سن رہا تھا۔ دوسرا انبوہ ان سفید پوشوں پر مشتمل تھا، جو عزّت کی خاطر اپنی اپنی چھتوں پر خالی ایریل لگا کر خود ایرانی ہوٹلوں اور پان کی دکانوں کے سامنے کھڑے کمنٹری سُن رہے تھے۔ پاکستان ایک میچ جیت چکا تھا اور کرکٹ کے خلاف ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالنا غدّاری کے مترادف تھا۔ مرزا کرکٹ کو اپنے آپ پر طاری کر کے کہنے لگے ''یہ کھیلوں کا بادشاہ ہے۔''

ہماری جو شامت آئی تو بول اُٹھے ''مرزا! کرکٹ رئیسوں کا کھیل ہے۔ دیکھتے نہیں یہ مر رہا ہے۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ کیوں کہ نہ اسے رُوسی کھیلتے ہیں نہ امریکی۔''

''اسی سے کچھ اُمید بندھتی ہے کہ شاید کھیل زندہ رہ جائے۔'' مرزا نے چُھوٹتے ہی دہلا لگایا۔ ایسا مہنگا اور پیچیدہ کھیل جس کا میچ مسلسل پانچ دن تک گھسٹتا رہے اور جسے ہمارے غریب عوام نہ کھیل سکیں اور نہ دیکھ پائیں، ہرگز لائقِ التفات نہیں۔'' ہم نے دُکھتی ہوئی رگ پکڑی۔

''پھر کون سا کھیل لائقِ التفات ہے، حضُور؟'' مرزا نے چڑاؤنے انداز میں پُوچھا۔

''اس سے بہتر تو بَیس بال رہے گی۔'' ہم نے کہا۔

''بات ایک ہی ہے۔ آدھا بیٹ ٹوٹ جانے کے بعد بھی کرکٹ جاری رہے تو امریکا میں اسے بیس بال کہتے ہیں۔ کسی اور کھیل کا نام لو۔'' مرزا نے کہا۔

''ٹینس۔'' ہمارے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اگر تم نے کبھی ٹینس میچ میں گیند کے ساتھ سینکڑوں تماشائیوں کی گردنیں ایک ساتھ پنڈولم کی طرح دائیں بائیں گھومتی دیکھی ہیں تو بخُدا تمھیں اس کھیل ہی سے نفرت ہو جائے گی۔'' مرزا نے کہا۔

''اس کے یہ معنی ہوئے کہ تمھیں ٹینس دیکھنے پر اعتراض ہے۔ مت دیکھو۔ مگر کھیلنے میں کیا حرج؟'' ہم نے دبایا۔

''جی نہیں! یورپ میں ٹینس بیمار مردوں اور تن درست عورتوں کا کھیل ہے۔ صاحب! اچھے

Scanned with CamScanner

کھیل کی خوبی یہ ہے کہ

کچھ ہاتھ ہلیں، کچھ پاؤں ہلیں، اچھلیں بازو، پھڑکے سب تن۔"

مرزا نے ایکا ایکی ہمارے مقابلے پر نظیر اکبر آبادی کو لا کھڑا کیا، جن سے نبٹنا فی الجُملہ ہمارے لیے مشکل تھا۔

"چلو ہاکی سہی۔" ہم نے سمجھوتے کے انداز میں کہا۔

"چھی! ہماری یہ بڑی کم زوری ہے کہ اپنی ٹیم کسی کھیل میں جیت جائے تو اُسے قومی کھیل سمجھنے لگتے ہیں اور اس وقت تک سمجھتے رہتے ہیں جب تک کہ ٹیم دوسرا میچ ہار نہ جائے۔" مرزا نے فتویٰ دیا۔

"تمھیں پسند نہ آئے، یہ اور بات ہے مگر کراچی میں ہاکی کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اگر کہیں دوستانہ میچ بھی ہو رہا ہو تو خلقت اس بُری طرح ٹوٹتی ہے کہ فیلڈ تک میں کھیلنے کی جگہ نہیں رہتی۔" ہم نے کہا۔

"خدا آباد رکھے، کراچی کا کیا کہنا! بندر روڈ پر کوئی شخص راہ چلتے یُوں ہی پان کی پیک تھوک دے اور پھر اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے تو دو منٹ میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں اور سارا ٹریفک رُک جائے۔ یاد رکھو! تماشے میں جان تماشائی کی تالی سے پڑتی ہے، نہ کہ مداری کی ڈگڈگی سے!" مرزا نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

"فٹ بال کیسی رہے گی؟" ہم نے عاجز آ کر آخر ان ہی سے پوچھا۔

مرزا کہنے لگے "کرکٹ اشراف کھیلتے ہیں۔ فٹ بال دیہاتیوں کا کھیل ہے۔ جٹ گنواروں کا! ہڈیاں تڑوانے کے اور بھی مہذّب طریقے ہو سکتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ! اس باجماعت بدتمیزی کو کھیل کس نے کہہ دیا؟ آپ نے شاید وہ لطیفہ نہیں سُنا کہ ایک پرانا کھلاڑی چند سکھوں کو فٹ بال کھیلنا سِکھا رہا تھا۔ جب کھیل کے سب قاعدے ایک ایک کر کے سمجھا چکا تو آخر میں یہ گُر کی بات بتائی کہ ہمیشہ یاد رکھو، سارے کھیل کا دار و مدار فقط زور سے کِک لگانے پر ہے۔ اس سے کبھی نہ چوکو۔ اگر گیند کو کِک نہ کر سکو تو پروا نہیں۔ اپنے مخالف ہی کو کِک کر دو۔ اچھا اب کھیل شروع کر دو۔ گیند کِدھر ہے؟ یہ سُن کر ایک سردار جی اپنا جانگیا چڑھاتے ہوئے بے تابی سے بولے۔ گیند دی ایسی تیسی! تسی کھیل شروع کرو، خالصہ!"

"لیکن گنواروں اور دیہاتیوں کے ساتھ کھیلنے میں کون سی ہیٹی ہوتی ہے؟" ہم نے اپنے جمہوری جذبے سے تقریباً نڈھال ہو کر پوچھا۔

"تفریح میں بُری صحبت سے پرہیز لازم ہے۔ یاد رکھیے۔ آپ تجارت اور عبادت تو کسی کے

ساتھ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن تاش صرف اشرافوں کے ساتھ کھیلنے چاہییں۔ یہیں نہیں، یورپ میں بھی اس فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ وہاں بڑے سے بڑے اسٹاک ایکسچینج اور گرجا میں ہر کس و ناکس کو بے روک ٹوک جانے کی اجازت ہے مگر کلب اور کسینو (قمار خانہ) میں فقط خاندانی شرفاء بار پاتے ہیں۔''

کیا عرض کریں، کرکٹ کے مخالفوں کو قائلِ معقول کرنے کے لیے مرزا کیسی کیسی دھاندلی رَوا سمجھتے ہیں اور آنِ واحد میں بات کو تنگنائے منطق سے نکال کر اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں بات کرتے دُشمنوں کی زبان کٹتی ہے۔ بات گنجلک ہوئی جاتی ہے۔ اس لیے ہم وضاحتاً ان کے بُرہان قاطع کی ایک ادنیٰ مثال پیش کرتے ہیں۔ ایک دن کرکٹ کے جسمانی فوائد (روحانی فیوض کا بیان آگے آئے گا) پر روشنی ڈالتے ہُوئے فرمانے لگے:

''کرکٹ سے کلائی مضبُوط ہوتی ہے۔''

''کلائی مضبُوط ہونے سے فائدہ؟''

''کرکٹ اچھا کھیلا جاتا ہے۔''

ایک اور نازک موقع پر انھوں نے اسی قسم کی منطق سے ایک کج فہم کا ناطقہ بند کیا۔ ان صاحب کا استدلال تھا کہ کرکٹ میں ہر وقت چوٹ چپیٹ کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ مرزا کو قائل کرنے کی غرض سے انھی کے سر کی قسم کھا کے کہنے لگے ''میرے سامنے کے تین دانت کرکٹ ہی کی نذر ہوئے۔ (اندرونی چوٹوں کا کوئی شمار نہیں) وہ تو کہیے بڑی خیر ہوئی کہ میرے اوسان خطا نہیں ہوئے۔ اگر میں عین وقت پر مُنہ نہ پھاڑ دیتا تو کہیں زیادہ نقصان ہوتا۔'' بعد کو انھوں نے کرکٹ کی راہ میں دیگر اعضائے بدن کے باری باری مجروح و ماؤف ہونے کی درد بھری داستان پیچ وار سنائی۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ ان کے اپنے تاریخی زخموں کی مجموعی تعداد رانا سانگا کے ستّر زخموں سے کسی طرح کم نہیں۔

مرزا نے جھنجھلا کر کہا ''مگر دستانے، پیڈ اور گارڈ آخر کس مرض کی دوا ہیں؟''

وہ صاحب بولے ''دیکھیے نا! یہ ذرہ بکتر تو خُود اس بات کی دلیل ہے کہ کھیل واقعی خطرناک ہے۔ ان حفاظتی تدابیر کا نام سُن کر مجھے اس وقت اپنے گاؤں کا وہ زمیندار یاد آ رہا ہے جس نے ستّر سال کی عمر میں ایک سولہ سالہ لڑکی سے شادی کی تھی۔ ابھی سُہاگ کے جوڑے کا کلف بھی ٹھیک سے نہ ٹوٹا ہوگا کہ وہ حالات پیدا ہو گئے جن میں بعض جلد باز اصحاب قتل کر بیٹھتے ہیں لیکن آدمی تھا بلا کا دُور اندیش۔ بہت کچھ غور و خوض اور اپنی طبیعت کے فطری رُجحان کو دیکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا کہ خودکشی نسبتاً آسان رہے گی۔ قتل میں بڑا کھڑاگ ہے۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں ریل اور

Scanned with CamScanner

بندوق کا غلط استعمال عام نہیں ہوا تھا۔ اِس لیے غیور حضرات کو کنوئیں جھانکنا پڑتے تھے لیکن اُن دِنوں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور کنویں کا پانی ایسا ٹھنڈا برف ہو رہا تھا کہ غصّے میں کوئی آدمی کُود پڑے تو چُھن سے آواز پیدا ہو۔ لہٰذا زمیندار نے ایک روئی کا فرغل اور دو موٹے موٹے لحاف اوڑھ کر کنوئیں میں چھلانگ لگائی اور آخر انھی لحافوں نے اسے نہ صرف سردی بلکہ حرام موت سے بھی بچالیا۔"

مرزا چٹخارہ لے کر بولے "بہت خُوب! آئندہ آپ اس لذیذ حکایت کو کرکٹ کے بجائے نکاحِ ثانی کے خلاف بطورِ دلیل استعمال کیجیے گا۔"

ہم نے بیچ میں پڑ کر مصالحت کرانے کی کوشش کی "ظاہر ہے لحاف اوڑھ کر کرکٹ نہیں کھیلا جا سکتا۔ مگر ایک بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کھلاڑی دبیز دستانے پہنتے ہیں، بھاری بھرکم پیڈ چڑھاتے ہیں، گارڈ باندھتے ہیں اور خدا جانے کیا کیا اَلا بلا اپنے اُوپر منڈھ لیتے ہیں، جب کہیں اپنے کو گیند سے محفوظ سمجھتے ہیں۔ لیکن آخر اس کے بجائے نرم گیند کیوں نہیں استعمال کرتے؟ سیدھی سی بات ہے۔"

مرزا صریحاً کنّی کاٹ کر فلسفہ بگھارنے لگے۔ "حضرت! مجھے سزا کے طور پر بھی وہ کھیل منظور نہیں جس میں چوٹ کا قوی احتمال نہ ہو۔ مردوں کو چوٹ کھا کے مسکرانے کی عادت ہونی چاہیے۔"

"چوٹ کھانے سے حاصل؟"

"آدمی مضبوط ہوتا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"آئندہ چوٹ لگے تو چیخ نہیں نکلتی۔"

مرزا کو کرکٹ سے کتنی دلچسپی اور اس کی باریکیوں سے کس حد تک واقفیت ہے، ہمیں اس کا تھوڑا بہت اندازہ پانچ سال قبل ہوا۔ ٹیسٹ کا چوتھا دن تھا اور ایک سلو بولر بولنگ کر رہا تھا۔ اس کی کلائی کے ایک ادنیٰ اشارے، انگلیوں کی ایک خفیف سی حرکت پر گیند ناچ ناچ اُٹھتی اور تماشائی ہر گیند پر کرسیوں سے اُٹھ اُٹھ کر داد دیتے اور داد دے کر باری باری ایک دوسرے کی گود میں بیٹھ بیٹھ جاتے۔ ہمارے پاس ہی، ایک میم کے پیچھے، کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا بوڑھا پارسی تک، اپنے پوپلے مُنہ سے سیٹی بجا بجا کر بولر کا دل بڑھا رہا تھا۔ ادھر اسٹیڈیم کے باہر درختوں کی پھننگوں سے لٹکے ہُوئے شائقین ہاتھ چھوڑ چھوڑ کر تالیاں بجاتے اور کپڑے جھاڑ کر پھر درختوں پر چڑھ جاتے تھے۔ ہر شخص کی نظریں گیند پر گڑی ہُوئی تھیں۔ یک بارگی بڑے زور کی تالیاں بجنے لگیں۔

"ہائے! بڑے غضب کی گُگلی ہے!" ہم نے جوش سے مرزا کا ہاتھ دبا کر کہا۔

Scanned with CamScanner

"نہیں یار! مدراس ہے!" مرزا نے دانت بھینچ کر جواب دیا۔

ہم نے پلٹ کر دیکھا تو مرزا ہی کی رائے صحیح نکلی۔ بلکہ بہت خُوب نکلی۔

ان کی دلچسپی کا اندازہ اس اہتمام سے بھی ہوتا ہے جو پچھلے تین برس سے ان کے معمولات میں داخل ہو چُکا ہے۔ اب وہ بڑے چاؤ سے لدے پھندے ٹیسٹ میچ دیکھنے جاتے ہیں۔ ڈیڑھ دو سیر بھوبل کی بُھنی مونگ پھلی، بیٹری کا ریڈیو[1] اور تھرماس! یہاں ہم نے ناشتے دان، سگرٹ، دُھوپ کی عینک اور اسپرو کی ٹکیوں کا ذکر اس لیے نہیں کیا یہ تو ان لوازمات میں سے ہیں جن کے بغیر کوئی دور اندیش آدمی یہ کھیل دیکھنے کا قصد نہیں کرتا۔ یوں تو تازہ اخبار بھی ساتھ ہوتا ہے مگر وہ اس سے چھتری کا کام لیتے ہیں۔ خود نہیں پڑھتے البتہ پیچھے بیٹھنے والے بار بار صفحہ اُلٹنے کی درخواست کرتے رہتے ہیں۔ دن بھر ریڈیو سے چمٹے کمنٹری سنتے رہتے ہیں بلکہ ہمارا خیال ہے کہ انھیں کمنٹری سننے سے زیادہ سنانے میں لُطف آتا ہے۔ البتہ کمنٹری آنا بند ہو جائے تو کھیل بھی دیکھ لیتے ہیں۔ یا پھر اس وقت سر اُٹھا کر فیلڈ کی طرف دیکھتے ہیں جب ریڈیو پر تالیوں کی آواز سے کانوں کے پردے پھٹنے لگیں۔ میچ کسی اور شہر میں ہو رہا ہو تو گھر بیٹھے کمنٹری کے جوشیلے حصّوں کو ٹیپ پر ریکارڈ کر لیتے ہیں اور آئندہ ٹسٹ تک اسے سُنا سُنا کر اپنا اور دُوسرے مسلمان بھائیوں کا خُون کھولاتے رہتے ہیں۔

جاہلوں کا ذکر نہیں، بڑے بڑوں کو ہم نے اس خوش فہمی میں مُبتلا دیکھا کہ زیادہ نہ کم پورے بائیس کھلاڑی کرکٹ کھیلتے ہیں۔ ہم قواعد و ضوابط سے واقف نہیں، لیکن جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اُسی کی قسم کھا کر عرض کرتے ہیں کہ درحقیقت کرکٹ صرف ایک ہی شخص کھیلتا ہے۔ مگر اس کھیل میں یہ وصف ہے کہ بقیہ اکیس حضرات سارے سارے دن اس مغالطے میں مگن رہتے ہیں کہ وہ بھی کھیل رہے ہیں۔ حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ حضرات شام تک سارس کی طرح کھڑے کھڑے تھک جاتے ہیں اور گھر پہنچ کر اس تکان کو تندرستی سمجھ کر پڑ رہتے ہیں۔

مرزا کہتے ہیں (ناممکن ہے کرکٹ کا ذکر ہو اور بار بار مرزا کی دہائی نہ دینی پڑے) کہ کھیل، علی الخصوص کرکٹ، سے طبیعت میں ہار جیت سے بے نیازی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ جیتنے کے لیے واقعی کاوش و مزاولت درکار ہے۔ لیکن ہارنے کے لیے مشق و مہارت کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ مشکل مخالف ٹیم بالعموم خود آسان کر دیتی ہے۔

اچھے اسکولوں میں شروع ہی سے تربیت دی جاتی ہے کہ جس طرح مرغابی پر پانی کی بُوند نہیں ٹھیرتی، اسی طرح اچھے کھلاڑی پر ناکامی کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض کم زور طبیعتیں اس نصیحت کا اس قدر اثر لیتی ہیں کہ ہر قسم کے نتائج سے بے پروا ہو جاتی ہیں۔

[1] اس زمانے میں ٹرانزسٹر عام نہیں ہوتے تھے۔

لیکن اگر ہم کھلے خزانے یہ اعتراف کر لیں کہ ہمیں جیت سے رنج اور ہار سے خوشی نہیں ہوتی تو کون سی عیب کی بات ہے؟ انگلستان کا بادشاہ ولیم فاتح اس سلسلے میں کمال بے ساختگی و صاف دلی کی ایک مُردہ مثال قائم کر گیا ہے جو آج بھی بعضوں کے نزدیک لائقِ توجہ و تقلید ہے۔ ہُوا یہ کہ ایک دفعہ جب وہ شطرنج کی بازی ہار گیا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ چوبی بساط جیتنے والے کے سَر پر دے ماری، جس سے اس گستاخ کی موت واقع ہوگئی۔ مؤرخین اس باب میں خاموش ہیں، مگر قیاس کہتا ہے کہ درباریوں نے یُوں بات بنائی ہوگی:

''سرکار! یہ تو بہت ہی کم ظرف نکلا۔ جیت کی ذرا تاب نہ لا سکا۔ شادیِ مرگ ہوگیا۔''

یہی قِصّہ ایک دن نمک مرچ لگا کر ہم نے مرزا کو سُنایا۔ بگڑ گئے۔ کہنے لگے:

''آپ بڑا فلسفہ چھانٹتے ہیں۔ مگر یہ ایک فلسفی ہی کا قول ہے کہ کوئی قوم سیاسی عظمت کی حامل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس نے کسی نہ کسی عہد میں اپنے کھیل کا لوہا نہ منوایا ہو۔''

ہم نے چھیڑا ''مگر قومیں پٹ پٹ کر ہی ہیکڑ ہوتی ہیں۔''

قوموں کو جہاں کا تہاں چھوڑ کر ذاتیات پر اُتر آئے۔ ''جس شخص نے عمر بھر اپنے دامنِ صحت کو ہر قسم کی کسرت اور کھیل سے بچائے رکھا، وہ غریب کھیل کی سپرٹ کو کیا جانے:

بچپن میں بھی تم کھیل جو کھیلے تو صنم کا

مَیں جانتا ہوں، تم جیسے ٹھُڑ دلے محض ہار کے ڈر سے نہیں کھیلتے۔ ایسا ہی ہے تو پرسوں صبح بغدادی جمخانہ آ جاؤ۔ پھر تمھیں دکھائیں کہ کرکٹ کیا ہوتا ہے۔''

اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ مذکور الصدر مقام پر ہر ہفتے دوستانہ میچ ہوتے رہتے ہیں (دوستانہ میچ سے مُراد ایسا میچ ہے جس میں لوگ ہار کر بھی قائل نہیں ہوتے) ابھی گزشتہ سنیچر کو عینک لگانے والوں کی ٹیم نے سگار پینے والوں کو پورے نو وکٹوں سے شکست دی تھی اور پرسوں ان کی کمپنی کے کنوارے ملازمین اپنے افسروں اور ان کی بیویوں سے شوقیہ میچ کھیل رہے ہیں۔ ہم نے کچھ ہچر مچر کی تو آنکھ مار کے کہنے لگے:

''بے پردگی کا خاص انتظام ہوگا۔ ضرور آنا۔''

ہم ناشتہ کرتے ہی بغدادی جمخانہ پہنچ گئے۔ پروگرام کے مطابق کھیل ٹھیک دس بجے شروع ہونا چاہیے تھا مگر امپائر کا سفید کوٹ استری ہو کر دیر سے آیا۔ اس لیے چھپے ہُوئے پروگرام کے بجائے ساڑھے گیارہ بجے تک کھلاڑی مونگ پھلی کھاتے رہے۔

پندرہ منٹ کی ردّوکد کے بعد طے پایا کہ جو ٹیم ''ٹاس'' ہارے وہی بیٹنگ کرے۔ پھر کل دار روپیہ کھنکا، تالیاں بجیں، معطّر رومال ہوا میں لہرائے اور مرزا کُسے بندھے بیٹنگ کرنے نکلے۔

ہم نے دعا دی ''خدا کرے تم واپس نہ آؤ۔''

مرزا نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور چلتے چلتے پھر تاکید کی ''کرکٹ مت دیکھو۔ کرکٹ کی اسپرٹ دیکھو۔''

ہم یہ بتانا بھول ہی گئے کہ روانہ ہونے سے قبل مرزا نے اپنے بَیٹ پر جُملہ تماشائیوں کے دستخط لیے۔ ایک خاتون نے (جو کسی طرف سے اَن پڑھ معلوم نہیں ہوتی تھیں) دستخط کی جگہ بیٹ پر اپنے ترشے ترشائے سُرخ سُرخ ہونٹ ثبت کر دیے اور مرزا پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتے ہُوئے وِکٹ تک پہنچے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سارا راستہ اُلٹے قدموں طے کیا اور اگر بیچ میں وکٹ سے ٹکّر نہ ہوتی تو شاید ساری فیلڈ اسی طرح پار کر جاتے۔

مرزا نے کرکٹ میں بھی وہی تیہا اور تیور دکھائے جو ہم ان کے مُچیٹوں اور معاشقوں میں دیکھتے چلے آئے تھے ـــــ یعنی تکنیک کم اور جوش زیادہ! روانگی سے چند منٹ پہلے پَیڈ کے تسمے باندھتے ہُوئے انھوں نے ایک مرکھنے سے کلرک کو یہ ہتھکنڈا بتایا کہ چھکّا لگانے کی سَہل ترکیب یہ ہے کہ خوب کَس کے ہِٹ لگاؤ۔

کلرک نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ زور کا ہِٹ کِس طرح لگایا جائے۔''

مرزا اپنی بڑی بڑی آنکھیں لال کر کے بولے ''مَیں تو یہ کرتا ہوں کہ ہِٹ لگاتے وقت آنکھ میچ کر اپنے افسر کا تصوّر کرتا ہوں۔ خُدائی قسم! ایسے زور کا ہِٹ لگتا ہے کہ گیند تارا ہو جاتی ہے۔''

مرزا کے کھیلنے بلکہ نہ کھیلنے کا انداز دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا کہ افسر کا ایک فوٹو نہیں، بلکہ پورا کا پورا البم اُن کی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ بیٹ کو پوری طاقت کے ساتھ گوپھن کی طرح گھمائے جا رہے تھے۔ تین اوور اسی طرح خالی گئے اور گیند کو ایک دفعہ بھی بَیٹ سے ہم کنار ہونے کا موقع نہیں ملا۔ مرزا کے مسکرانے کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وُہ اس صُورتِ حال کو بولر کی نالائقی سے زیادہ اپنے اُستادانہ ہتھکنڈوں پر محمول کر رہے ہیں۔ مگر اتفاق سے چوتھے اَوور میں ایک گیند سیدھوں سِیدھ بَیٹ پر جا لگی۔ مرزا پوری طاقت سے بَیٹ دُور پھینک کر چیخے:

''ہاؤز دیٹ؟''

امپائر دوڑا دوڑا آیا۔ بَیٹ اُٹھا کر انھیں پکڑایا اور بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر دوبارہ کھیلنے پر رضامند کیا۔

مُصیبت اصل میں یہ تھی کہ مخالف ٹیم کا لمبا تڑنگا بولر، خدا جُھوٹ نہ بلوائے، پُورے ایک فرلانگ سے ٹہلتا ہُوا آتا۔ یک بارگی جھٹکے کے ساتھ رُک کر کھنکارتا۔ پھر خلافِ توقع نہایت تیزی سے گیند پھینکتا۔ اس کے علاوہ، حالانکہ صرف دائیں آنکھ سے دیکھ سکتا تھا مگر گیند بائیں ہاتھ سے پھینکتا تھا۔

Scanned with CamScanner

مرزا کا خیال تھا کہ اس بے ایمان نے یہ چکرا دینے والی صورت انتظاماً بنا رکھی ہے۔ لیکن ایک مرزا ہی پر موقوف نہیں، کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ گیند کیسے اور کہاں پھینکے گا۔ بلکہ اس کی صورت دیکھ کر کبھی کبھی تو یہ شبہ ہوتا تھا کہ اللہ جانے پھینکے گا بھی یا نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس نے گیند سے اتنے وکٹ نہیں لیے جتنے گیند پھینکنے کے انداز سے۔ بقول مرزا ''مشتاق بولر سے کوئی خائف نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ وکٹ ہی تو لے سکتا ہے۔ جان تو اناڑی سے نکلتی ہے۔'' سبھی کے چھکے چھوٹ گئے۔ گیند پھینکنے سے پہلے جب وہ اپنی ڈھائی گھر کی چال سے لہریا بناتا ہوا آتا تو اچھے اچھوں کے بیٹ ہاتھ کے ہاتھ میں رہ جاتے۔

آگے بڑھا کوئی تو کوئی ڈر کے رہ گیا
سکتے میں کوئی منہ پہ نظر کر کے رہ گیا

ہر مرتبہ ظالم کچھ ایسے غیر پیشہ وارانہ جذبے اور جوش کے ساتھ کچکچا کے گیند پھینکتا گویا یہ وہ پہلا پتھر ہے جس سے ایک گنہگار دوسرے گنہگار کو سنگسار کرنے جا رہا ہے۔ اس کے باوجود مرزا انتہائی دندان شکن حالات میں ڈنڈے گاڑے کھڑے تھے۔

لیکن یہ دُرست ہے کہ رَن نہ بننے کی بڑی وجہ مرزا کے اپنے پینترے تھے۔ وہ اپنی وکٹ ہتھیلی پر لیے پھر رہے تھے۔ وہ کرتے یہ تھے کہ اگر گیند اپنی طرف آتی ہوتی تو صاف ٹل جاتے لیکن اگر ٹیڑھی آتی دکھائی دیتی تو اس کے پیچھے بیٹ لے کر نہایت جوش و خروش سے دوڑتے (کپتان نے بہتیرا اشاروں سے منع کیا مگر وہ دو دفعہ گیند کو باؤنڈری لائن تک چھوڑنے گئے) البتہ ایک دفعہ جب وہ اپنے بیٹ پر لپ اسٹک سے بنے ہوئے ہونٹوں کو محویت سے دیکھ رہے تھے تو گیند اچانک بیٹ سے آ لگی اور وہ چمک کر ہوا میں گیند سے زیادہ اُچھلے۔ وکٹ کیپر اگر بڑھ کر بیچ میں نہ پکڑ لیتا تو ایسے اوندھے منہ گرتے کہ ہفتوں اپنی شکل آپ نہ پہچان پاتے۔

یوں بھی بعض کھلاڑی گیند کو دیکھتے نہیں، سُنتے ہیں ـــــ یعنی ان کو اپنے قرب و جوار میں گیند کی موجودگی کا احساس پہلے پہل اس آواز سے ہوتا ہے جو گیند اور وکٹ کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔

چند اوور کے بعد کھیل کا رنگ بدلتا نظر آیا اور یوں محسوس ہونے لگا گویا وکٹ گیند کو اپنی جانب اس طرح کھینچ رہا ہے جیسے مقناطیس لوہے کو۔ ہم نے دیکھا کہ ساتویں اوور کی تیسری گیند پر مرزا نے اپنی مسلح اور مُسلّم ران درمیان میں حائل کر دی۔ سب یک زبان ہو کر چیخ اٹھے:

''ہاؤز دیٹ؟''

''مرزا نے دانستہ اپنی ٹانگ اس جگہ رکھی جہاں مَیں ہمیشہ گیند پھینکتا ہوں۔'' بولر نے الزام لگایا۔

Scanned with CamScanner

''بکواس ہے۔ بات یُوں ہے کہ اس نے جان بُوجھ کر اس جگہ گیند پھینکی جہاں مَیں ہمیشہ اپنی ٹانگ رکھتا ہوں۔'' مرزا نے جواب دیا۔

''اگر میرا نشانہ ایسا ہی ہوتا تو مرزا جی کبھی کے پویلین میں براجمان ہوتے۔'' بولر بولا۔

''تو یوں کہو کہ تمھاری گیند وکٹ سے الرجک ہے۔'' مرزا نے کہا۔

''مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مرزا نے عمداً ٹانگ آگے کی۔'' یک چشم بولر نے حلفیہ کہا۔

امپائر نے دونوں کو سمجھایا کہ بحثا بحثی کرکٹ کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ پھر یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ بیٹسمین کے کھیل کے محتاط اسٹائل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اُسے ذرا بھی احتمال ہوتا کہ گیند اس کی ٹانگ کی طرف آرہی ہے تو وہ کھٹاک سے وکٹ کو اپنی ٹانگ کے آگے کر دیتا۔

اس فیصلے پر مرزا نے اپنی ٹوپی اُچھالی اور جب وہ اپنے مرکز کی طرف واپس آ گئی تو پھر کھیل شروع ہوا۔ لیکن دوسرے ہی اُوور میں بولر نے گیند ایسی کھینچ کے ماری کہ مرزا کے سر سے ایک آواز (اور مُنہ سے کئی!) نکلی اور ٹوپی اُڑ کر وکٹ کیپر کے قدموں پر جا پڑی۔

جب امپائر نے مرزا کو ٹوپی پہنانے کی کوشش کی تو وہ ایک اِنچ تنگ ہو چکی تھی!

اس کے باوجود مرزا خُوب جم کر کھیلے اور ایسا جم کر کھیلے کہ ان کی اپنی ٹیم کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اس اجمالِ پُرملال کی تفصیل یہ ہے کہ جیسے ہی ان کا ساتھی گیند پر ہٹ لگاتا ویسے ہی مرزا اُسے رَن بنانے کی پُرزور دعوت دیتے اور جب وہ کشاں کشاں ۴/۳ پچ طے کر لیتا تو اسے ڈانٹ ڈپٹ کر، بلکہ دھکیل کر، اپنے وکٹ کی جانب واپس بھیج دیتے۔ مگر اکثر یہی ہُوا کہ گیند اس غریب سے پہلے وہاں پہنچ گئی اور وہ مُفت میں رَن آؤٹ ہو گیا۔ جب مرزا نے یکے بعد دیگرے اپنی ٹیم کے پانچ کھلاڑیوں کا، بشمول کپتانِ ذی شان، اس طرح جلوس نکال دیا تو کپتان نے پسماندگان کو سختی سے تنبیہ کر دی کہ خبردار! اب مرزا کے علاوہ کوئی رن نہ بنائے۔

لیکن مرزا آخری وکٹ تک اپنی وضع احتیاط پر ثابت قدمی سے قائم رہے اور ایک رَن بنا کے نہیں دیا۔ اس کے باوجود ان کا اسکور اپنی ٹیم میں سب سے اچھا رہا۔ اس لیے کہ رن کسی اور نے بھی نہیں بنائے، مگر وہ سب آؤٹ ہو گئے۔ اس کے برعکس مرزا خود کو بڑے فخر کے ساتھ ''زیرو ناٹ آؤٹ'' بتاتے تھے۔ ناٹ آؤٹ! اور یہ بڑی بات ہے۔

کھیل کے مختصر وقفے کے بعد طویل لنچ شروع ہُوا۔ جس میں بعض شادی شُدہ افسروں نے چھک کے بیئر پی اور اُونگھنے لگے۔ جنھوں نے نہیں پی، وہ ان کی بیویوں سے بدتمیزیاں کرنے لگے۔ جب چائے کے وقت میں کُل دس منٹ باقی رہ گئے اور بیرے جھپاک جھپاک پیالیاں لگانے لگے تو

مجبوراً کھیل شروع کرنا پڑا۔ دو کھلاڑی امپائر کو سہارا دے کر پچ تک لے گئے اور مرزا نے بولنگ سنبھالی۔ پتا چلا کہ وہ بولنگ کی اس نایاب صنف میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں جسے ان کے بدخواہ ''وائڈبال'' کہنے پر مُصر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹ لگے بغیر بھی دھڑا دھڑ رن بننے لگے۔ تین اوور کے بعد یہ حال ہو گیا کہ مرزا ہر گیند پر گالی دینے لگے۔ (شکار میں بھی ان کا سدا سے یہی دستور رہا کہ فیر کرنے سے پہلے دانت پیس کر تیتر کو کوستے ہیں اور فیر کرنے کے بعد بندوق بنانے والے کارخانے کو گالیاں دیتے ہیں۔)

ہم بولنگ کی مختلف قسموں اور باریکیوں سے واقف نہیں۔ تاہم اِتنا ضرور دیکھا کہ جس رفتار سے مرزا وکٹ کی طرف گیند پھینکتے، اس سے چوگنی رفتار سے واپس کر دی جاتی۔ وہ تھوڑی دیر کج رفتار گیند کو حیرت اور حسرت سے دیکھتے۔ بار بار اس پر اپنا دایاں کفِ افسوس ملتے۔ پھر بھدر بھدر دوڑتے اور جب اور جہاں سانس بھر جاتی وہیں اور اسی لمحے لُنجے ہاتھ سے گیند پھینک دیتے۔

مُنہ پھیر کر اِدھر کو، اُدھر کو بڑھا کے ہاتھ

ابتدا میں تو مخالف ٹیم ان کی بولنگ کے معیار سے نہایت مطمئن و محفوظ ہوئی۔ لیکن جب اس کے پہلے ہی کھلاڑی نے پندرہ منٹ میں تیس رن بنا ڈالے تو کپتان نے اصرار کیا کہ ہمارے دُوسرے بیٹسمین رہے جاتے ہیں۔ ان کو بھی موقع ملنا چاہیے۔ اس لیے آپ اپنا بولر بدلیے۔

مرزا بولنگ چھوڑ کر پویلین میں آ گئے۔ مارے خوشی کے کانوں تک باچھیں کِھلی پڑ رہی تھیں۔ جب وہ اپنی جگہ پر واپس آ گئے تو مُنہ ہمارے کان سے بھڑا کر بولے:

''کہو، پسند آئی؟''

''کون؟ کدھر؟'' ہم نے پوچھا۔

ہمارا ہاتھ جھٹک کر بولے ''نرے گاؤدی ہو تم بھی! مَیں کرکٹ کی اسپرٹ کی بات کر رہا ہُوں۔''

Scanned with CamScanner